© rasailojaraid.com

قسط:۵

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد*

چنیوٹ میں قیام:

لائل پور سے چنیوٹ آئے تو میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ جہاں میرے اُستاد ماسٹر محمد صادق صاحب انتہائی مخلص، محنتی، اور دینی شخصیت کے مالک سادگی جن کا شعار تو محنت جن کا وقار تھا، ان کی کلاس میں کمزور لڑکوں کو دیر سے چھٹی ملتی تھی۔ وہ کمزور لڑکوں کو چھٹی کے بعد بھی بغیر کسی معاوضے کے پڑھاتے۔ کہتے تھے کہ میری کلاس میں کمزور لڑکوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ سادہ اس قدر کہ تہبند باندھتے، دیسی کرتا، دیسی چمڑے کی جوتی استعمال میں لاتے۔ گھر سے سکول آتے ہوئے تہبند میں ہی ہوتے۔ ایک تھیلے میں شلوار رکھ لیتے اور سکول کھلنے سے پہلے کسی کمرے میں شلوار پہن لیتے اور تہبند کو اُسی تھیلے میں ڈال لیتے۔ جاتے ہوئے پھر تہبند باندھ لیتے۔ انگریزی تہذیب وتمدن کے انتہائی خلاف تھے۔ ان کی شاگردی پر مجھے آج بھی ناز ہے، اس لیے کہ انگریزوں سے نفرت بھی جیسے ان کے نصاب میں ہو۔

والدِ محترم تو انجمن اسلامیہ کے ملازم ہوگئے اور اسی اسلامیہ ہائی سکول میں انگلش ٹیچر کی حیثیت میں انہوں نے کام شروع کر دیا۔ ہم سب شاہی مسجد کے عقب میں اپنے دادا جان کے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ گھر سے دفتر احرار چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ شاہی مسجد کے عقب میں شاہی منڈی کے شمال مغربی کونے میں مجلس احرارِ اسلام چنیوٹ کا دفتر جس پر سُرخ ہلالی پرچم بڑی شان وشوکت کے ساتھ ہر وقت لہراتا رہتا۔ میں اپنے فارغ وقت میں کبھی اکیلا اور کبھی اپنے چچا منیر احمد کے ساتھ جو ہمارے ساتھ ہی لائل پور سے چنیوٹ آ گئے تھے دفتر احرار آ جاتا۔ احرار رضا کار مجھے گھیر لیتے، کبھی کسی رضا کار کی گود میں ہوتا تو کبھی کسی رضا کار کے کندھے پر سوار وہ مجھے باری باری اٹھاتے اور پیار بھی کرتے۔ اکثر ایسے رضا کار بھی تھے جو میرے دادا جان اور ابا جان کے نہ صرف جاننے والے تھے بلکہ ان کے معتقد بھی تھے۔ ان رضا کاروں نے پہلا سبق یہ مجھے دیا کہ وہ سوال کرتے کہ ''احرار کے کیا معنیٰ ہیں؟'' میں اُن کا بتایا ہوا جواب دہرا دیتا۔ ''احرار جمع حُر کی، حُر معنی آزاد''۔ ''احرار کیا چاہتے ہیں؟'' میں جواب دیتا ''احرار آزادیٔ ہند چاہتے ہیں''۔ نعرے جو مجھے بچپن سے ہی ان رضا کاروں سے ملے وہ بھی دو ہی تھے۔ ''انقلاب زندہ باد''۔ ''مجلس احرار اسلام زندہ باد''۔ ایسے ماحول میں میرے چہرے پر ایک خاص قسم کی رونق عود کر آتی۔ مجھے اپنے ہر سانس میں ایک عجیب سی تازگی اور روح میں طراوت سی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی رات کو بھی دفتر احرار چلا آتا۔ دفتر میں بڑی رونق ہوتی۔ سیکڑوں احرار رضا کار جمع ہوتے۔ یہ اُن کی پریڈ کا وقت ہوتا۔

* نائب امیر مجلس احرارِ اسلام پاکستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رات کو پوری شاہی منڈی دفتر احرار میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ شاہی منڈی میں سرخ وردی میں ملبوس احرار رضا کاروں کی صف بندی ایک عجیب سماں پیدا کر دیتی تھی۔ پریڈ کے ''کاشن'' عربی میں تھے۔ جو پہلے پہلے تو مجھے بہت مشکل لگے لیکن چند ہی دنوں میں از بر ہو گئے، کبھی کبھی دن کے وقت بھی رضا کار پریڈ کے لیے نکلتے میں ان کے ساتھ ہوتا۔ پورے شہر کا گشت کرتے اور ساتھ ساتھ ترانا گاتے جس کے بول اس طرح تھے۔(۱)

ترانۂ احرار:

اٹھ مجاہدِ وطن ڈال دوش پر کفن
کُند تیغ ہے تری سان پر چڑھائے جا
اسلحہ سجائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا
اٹھ! خدا کا واسطہ مُصطفیٰ کا واسطہ
نامِ دیں بلند کر بانگِ حق سنائے جا
قوم کو جگائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا
آں صلوٰۃ و صوم اُف ترک کردہ قوم تُف
ہے نمازِ خوف کیا؟ بات یہ بتائے جا
حکمِ دیں سنائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا
نامرادِ حریت کر جہاد حریت
موت مر شہید کی خوب مسکرائے جا
زندگی بنائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا
سُرخ پوش ہے تو آ سرفروش ہے تو آ
ہاں ''حُسین'' کی طرح رنج و غم اٹھائے جا
''کربلا'' بنائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

(۱) یہ ترانہ جناب عبدالجلیل خان ایڈووکیٹ مرحوم (سابق سالار جیوش احرارِ اسلام صوبہ یوپی، ہند) نے ۱۹۳۴ء میں لکھا۔ جسے قائد احرار جانشین امیر شریعت مولانا سید ابوذر بخاریؒ نے الگ کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔(مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھ میں علم اٹھا تیز تر قدم اٹھا
عرصۂ قتال تک جیش کو لڑائے جا
تو پَرا جمائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

سامنے سے جنگ ہے توپ ہے تُفنگ ہے
گولیوں پہ گولیاں مسکرا کے کھائے جا
خون میں نہائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

ملک و نسل و رنگ یہ؟ موجباتِ جنگ یہ؟
امتیازِ قومیت سربسر مٹائے جا
سامراج ڈھائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

کیا ''خلافتِ'' خدا؟ قوم سے ہوئی جدا؟
''شرع'' کا نفاذ کر ''حدّ'' پہ حد لگائے جا
راستہ دکھائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

کر ''امام'' ایک کو ''متقی وَ نیک'' کو
حکمِ حق کے سامنے اپنا سر جھکائے جا
''اِتّقا'' سکھائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

''صاحبِ نصاب'' بن ''قابلِ خطاب'' بن
دے ''زکوٰۃ جسم و جاں'' مال و زر لٹائے جا
آبرو بنائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

یہ ''صدیٰ'' سنائے جا وجد و کیف لائے جا
شعر یہ ''جلیل'' کے بار بار گائے جا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گُل فضاء پہ چھائے جا
ہاں قدم بڑھائے جا

ملک نذر محمد اعوان سالار تھے۔ ان کی وردی تمام رضا کاروں سے مختلف ہوتی۔ پوری فوجی وردی میں ملبوس جیسے فوج کے میجر ہوں۔ دراز قامت، چھریرا جسم، چوڑی چھاتی، متحرک آنکھیں، چہرے پہ عجیب رونق، سراپا عزمِ جواں کی قسم کھاتا محسوس ہوتا، قدموں کی تھاپ سے بلند ہونے والی آواز جیسے عزم و استقلال کی داستان بیان کر رہی ہو۔ دل میں غلامی کے خلاف نفرت اور آزادی کے لیے تڑپ دماغ کو معطر بھی کرتی اور مسحور بھی۔ جہاں جہاں سے احرار رضا کاروں کا یہ جیش گزرتا لوگ استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ چلتے قدم رک جاتے اور بعض اوقات تو دیکھنے والے لوگ بھی مجلس احرار زندہ باد اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ میں تیسری جماعت کا طالب علم جب یہ سب کچھ دیکھتا تو سوچتا یہ سب رضا کار آخر اس طرح کیوں پریڈ کرتے ہیں۔ ان میں وہ کون سا جذبہ ہے جو انہیں بے چین و مضطرب کیے ہوئے ہے۔ یہ انگریز کون ہیں جن سے یہ آزادی کے خواہش مند ہیں۔ آزادی ہوتی کیا ہے؟ یہ سوالات دماغ میں اٹھتے مگر دماغ میں ہی کہیں گم ہو جاتے اور پھر ساری توجہ اس دلکش، دلربا اور روح پرور پریڈ اور ترانے کی طرف مبذول ہو جاتی۔ جب کوئی شہر کا اہم چوک آتا تو سالار کے ''کاشن'' پر پریڈ روک دی جاتی اور فضا انقلاب زندہ باد، احرارِ اسلام زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھتی، شہر میں گشت کا یہ پروگرام کبھی کبھی ہوتا تھا۔ لیکن دفتر میں رات کے وقت رضا کاروں کی حاضری روزانہ ہوتی۔ ہمارے ایک رضا کار عبدالحکیم ایف۔اے پاس تھے۔ وہ کبھی چودھری افضل حقؒ کی ''زندگی'' پڑھ کر رضا کاروں کو سناتے تو کبھی ''تاریخ احرار'' کے اوراق ان کے سامنے ہوتے اور تمام رضا کار ہمہ تن گوش ''تاریخ احرار'' کے اقتباس سنتے، احرار آرگن ''افضل'' باقاعدگی کے ساتھ دفتر احرار آتا جو سہارن پور سے شائع ہوتا تھا۔ رات کو شاہی منڈی تقریباً ساری کی ساری دفتر احرار میں تبدیل ہو جاتی جہاں چارپائیوں پہ بیٹھ کر احرار رضا کار آپس میں گپ شپ بھی کرتے اور جماعتی زندگی کے بارے میں بھی گفتگو ہوتی۔ کبھی امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی کوئی بات، تو کبھی مفکرِ احرار چودھری افضل حقؒ کا تذکرہ، کبھی کسی احرار لیڈر کی قید تنہائی کا قصہ تو کبھی کسی دوسرے احرار لیڈر کی شعلہ بیانی کا ذکر۔ شہر میں خدمت خلق کے کام کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی جاتی۔ شہری مسائل بھی زیر بحث آتے غرض یہ اکٹھ کئی لحاظ سے جماعتی زندگی میں روانی، استحکام اور استقلال کا باعث بنتا۔

الٰہی بخش چنیوٹی کی شہادت:

شہر چنیوٹ، شہر احرار بن گیا تھا۔ اس لیے کہ تحریک کشمیر ۱۹۳۰ء میں الٰہی بخش چنیوٹی کی شہادت نے پورے شہر کو مجلس احرار کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میری والدہ مرحومہ بتاتی تھیں کہ جب الٰہی بخش کا جسد خاکی کشمیر سے چنیوٹ لایا گیا تو شہر کا جوش و خروش ایسا تھا کہ الفاظ اسے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک ایسی کیفیت جو الفاظ کے نرغے سے ماورئی ہو،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورے شہر پر حاوی تھی۔ روزانہ جلوس نکلتے اور الٰہی بخش کی شہادت کے ترانے گائے جاتے۔ شہر کے ہر چوک میں سرخ رنگ کے ٹب رکھ دیے گئے تھے اور لوگ اپنی سفید قمیص گھر سے لاتے اور اسے سرخ رنگ میں ڈبو کر جلوس میں شامل ہو جاتے۔ گرفتاری کے لیے کشمیر جانے والے رضا کاروں کے گلے میں ہار ڈال دیے جاتے۔ جس سے معلوم ہوتا کہ آج یہ رضا کار تحریک کشمیر کے لیے کشمیر جائیں گے۔ الٰہی بخش کی تدفین کے دوسرے روز جب جلوس نکالا گیا تو کشمیر جانے والے رضا کاروں میں الٰہی بخش شہید کا کم سن بیٹا محمد عمر بھی شامل تھا۔ ماں نے نہلا دھلا کر سرخ قمیص پہنا کر اسے رضا کاروں میں شامل کرنے پر اصرار کیا تو منتظمین مجبور ہو گئے۔ اسے کشمیر تو نہ بھیجا گیا لیکن ایک ماں کے اس اقدام نے پورے شہر میں ہلچل مچا دی اور دین اسلام کے لیے جذبۂ جہاد یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنے پورے عروج پر ہے۔ لوگوں کے جوش و خروش میں اس اقدام سے بے انتہا اضافہ ہوا اور تحریک کو بھی اس سے استحکام حاصل ہوا۔ کچھ اس قسم کے پنجابی اشعار الٰہی بخش شہید کے بارے میں والدہ سناتی تھیں کہ پڑھے جاتے تھے:

صدقے جائیے تیری موت توں ساڈی اکھاں دیا تاریا
شیراں وانگوں للکاردیاں نعرے تکبیراں دے ماردیاں
باپ شہادت پا گیا پُتر اوہ دی تھاں گیا
پیش شہادت کر کے توں تن من دین توں واریا
صدقے جائیے تیری موت توں ساڈی اکھاں دیا تاریا

الٰہی بخش شہید کے بارے میں ماسٹر تاج الدین انصاریؒ اپنی کتاب ''احرار اور تحریک کشمیر'' میں تحریر کرتے ہیں:

''میر پور کے مورچہ پر ڈوگرہ سپاہی سنگین تانے کھڑے تھے۔ چنیوٹ کا بہادر احرار رضا کار الٰہی بخش شہید اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا آگے بڑھا۔ سنگین اس خوبصورت نوجوان کے سینے کے پار ہو گئی۔ اللہ کا نام بلند کرتے ہوئے یہ خوبصورت نوجوان کلمہ شہادت پڑھ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مسلمانوں کے مقدس خون کا یہ پہلا قطرہ تھا جس نے مسلمانانِ پنجاب کے دلوں کو گرما دیا۔ اس کے بعد احرار رضا کاروں کا سیلاب ریاست اور بیرون ریاست کے تمام سرکاری انتظامات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کے لے گیا۔''

مشہور احرار شاعر علامہ انور صابری مرحوم نے الٰہی بخش شہید کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا:

فطرت نے عطا کی ہے جسے مستیِ جاوید
میخانۂ صہبائے شہادت کے سُبو سے
احرار کے جذبات کی تعمیر مکمل
کشمیر میں لاریب ہوئی اس کے لہو سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریک کشمیر میں چنیوٹ شہر سے بے شمار لوگ گرفتار ہوئے اورانہوں نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی قید کی مدت پوری کی۔ حافظ دوست محمد جو اپنے جسم کے اعتبار سے بھاری بھرکم تھے انہیں بیل کی جگہ کنویں چلانے کے لیے جوت دیا جاتا۔ اس کے علاوہ شیخ محمد امین پان فروش، شیخ اللہ دین صاحب مرحوم اوراس طرح کئی دوسرے لوگوں نے تحریک میں حصہ لیا۔

یہ تھا وہ ماحول جس نے پورے شہر کو بیدار کر رکھا تھا۔ اب ایسے ماحول میں دن رات اپنے تعلیمی اوقات سے فارغ ہو کر دفتر احرار میں وقت بسر کرتا۔ میری طرح کچھ اور کم سن لڑکے بھی دفتر آتے۔ ایک اچھی خاصی بچوں کی تعداد واقف ہوگئی۔ ہم سب اس احراری ماحول سے متاثر تھے اوراس ماحول کا رنگ ہمارے دل و دماغ پر ہی نہیں ہماری روح میں بھی رچ بس گیا تھا۔ ان بچوں میں میرے علاوہ کئی دوسرے نام بھی ہیں۔ لیکن دو نام اپنی اہمیت کے اعتبار سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ایک نام خالد بن الٰہی بخش شہید کا ہے جو اپنے والد کی شہادت کے بعد پیدا ہوا اور عمر میں مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ اور دوسرا نام عزیز بھراڑہ کا ہے وہ بھی مجھ سے عمر میں بڑا تھا۔ عزیز بھراڑہ کا نام تو دل پہ اس طرح نقش ہوا کہ اب موت کے بعد بھی شاید نہ مٹ سکے گا۔ اس کے بارے میں چند اہم باتیں نذر قارئین کرنا ضروری ہیں۔

عزیز بھراڑہ مرحوم:

شیخ خاندان کا لڑکا، میرے محلے کے پاس ہی سبز محل کے سامنے اس کا مکان تھا۔ میں جب تیسری جماعت کا طالب علم تھا تو یہ پانچویں جماعت میں تھا۔ اس سے دوستانہ ہوگیا۔ وہ بھی میری طرح دفتر احرار آجاتا اور ہماری دوستی کے آغاز کی وجہ بھی یہی تھی۔ وہ بھی میری طرح جماعتی ماحول سے شدید متاثر تھا۔ خالد بن شہید، عزیز بھراڑہ اور میں ہم تینوں نے مل کر بچوں کی ایک الگ احرار تنظیم بنانے کا مشورہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ عزیز بھراڑہ کو اس کا سالار بنا دیا جائے۔ چنانچہ ارد گرد کے چند محلوں سے ہم نے کوشش کر کے تقریباً چالیس پچاس کے قریب اپنے ہم عمر لڑکے اکٹھے کر لیے اور عزیز بھراڑہ کو ہم نے اپنا سالار بنالیا۔ ہم نے کسی مستعار بیٹھک میں اپنا الگ دفتر بھی کھول لیا۔ جہاں باقاعدہ رجسٹر حاضری رکھا گیا۔ ہم روزانہ اکٹھے ہوتے اور شہر میں کسی جگہ صف بندی کر کے پریڈ بھی کرتے۔ ہماری تنظیم دن بدن منظم ہوتی گئی اوراس میں شہر کی جماعت کی سرپرستی بھی ہمیں حاصل تھی۔ جس نے ہمیں فعال اور منظم ہونے میں بڑی مدد کی۔

ایک دن ملک اللہ دتہ مرحوم و مغفور صدر شہر نے مجھے کہا کہ آگرہ کی مجلس احرارِ اسلام کے صدر جن کا بنیادی تعلق چنیوٹ سے ہے وہ آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں تمہاری پریڈ دیکھنے کی دعوت دی ہے تم اپنے سالار سے کہو کہ کل پچھلے پہر وہ اپنے تمام رضا کاروں کو عید گاہ میں اکٹھے ہونے کے لیے کہے وہاں انہیں آپ کی پریڈ دکھائی جائے گی۔ عزیز سالار نے دوسرے روز ہم سب کو عید گاہ میں اکٹھا کر لیا۔ آگرہ کی جماعت کے صدر آئے اور ہماری پریڈ دیکھی، عربی کاشن میں جب ہم نے پوری پریڈ انہیں دکھائی اور مارچ کر کے بھی دکھایا تو وہ انتہائی مسرور ہوئے اور انہوں نے خوش ہو کر پچاس روپے ہمیں بطور انعام بھی دیے۔ شہر میں بھی ہم اپنے بڑوں کی طرح پریڈ کے لیے نکلتے تھے۔ لوگ ہمیں پریڈ کرتے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمارے سالار عزیز بھراڑہ ایک قادیانی گھر کے چشم و چراغ تھے۔ باپ تو پکا قادیانی تھا۔ بھائی نیم قادیانی اور والدہ کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ وہ کیا تھی۔ عزیز اکثر مجھ سے اس بات کا ذکر کرتا کہ میرا والد مجھے بہت تنگ کرتا رہتا ہے کہ تم احرار چھوڑ دو ورنہ میں گھر سے نکال دوں گا۔ لیکن میں نے تو گھر میں کہہ دیا ہے کہ احرار جماعت کو تو چھوڑنا مشکل ہے جس کے مقابلے میں مجھے گھر چھوڑنا بڑا آسان معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال عزیز بھراڑہ جماعت احرار کا ایک فعال نونہال کارکن رہا۔ اس کے جذبۂ احراریت میں مزید پختگی آتی چلی گئی۔ شہر میں اس تنظیم کی وجہ سے ہم تین چار لڑکوں کا بڑا چرچا ہو گیا۔ جب میں پانچویں جماعت میں تھا تو اس وقت عزیز ساتویں جماعت میں۔ اس وقت ہماری یہ تنظیم اپنے پورے عروج پر تھی، مشتاق تھہیم، چھوٹے بھائی صغیر باقر، بشیر وسیر، عمر درارز بلوچ اور چند دوسرے لڑکے اس تنظیم کے فعال کارکن تھے۔

عزیز بھراڑہ کی وفات:

۱۹۴۵ء میں شہر میں ہیضے کی وبا پھیلی مجھے یاد ہے کہ پہلی رمضان کو ہم دونوں حسبِ معمول اکٹھے ہوئے تو عزیز نے مجھے کہا کہ یار شبّیر! یہ بڑا مقدس مہینہ ہے میں نے سنا ہے کہ اس مہینے میں جس کی موت وقع ہو جاتی ہے وہ سیدھا جنت میں چلا جاتا ہے۔ میں نے جواب میں کہا یہ بات تو درست ہے علما حضرات ایسا ہی کہتے ہیں۔ تو عزیز نے ایک لحظہ توقف کیے بغیر کہا کہ ''کاش مجھے بھی اسی مہینے موت آجائے اور میں بھی جنت میں چلا جاؤں۔'' میں نے اس پر ناراض ہو کر کہا کہ کیا تو نے اتنی جلدی مجھ سے جدا ہونے کی ٹھان لی ہے۔ میں تو اب تمہارے بغیر زندہ رہنا بھی مشکل محسوس کرتا ہوں۔ میری ہر صبح اور ہر شام تمہارے ساتھ گزرتی ہے اور ہمارا آپس کا پیار تو اب تذکرۂ خاص و عام ہو چکا ہے، چل ایسی بات نہیں کرتے ہمیں تو بڑا ہو کر اپنی جماعت کا ابھی بہت کام کرنا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی اور ہم پہلی رمضان کی تراویح پڑھنے مسجد میں چلے گئے۔ جہاں ہماری ملاقات تیسرے دوست مشتاق تھہیم سے ہوئی۔ تراویح پڑھنے کے بعد ہم دونوں ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر نہ جانے کب تک اکیلے باتیں کرتے رہے، ہماری یہ آخری ملاقات تھی۔ ملاقات کیا تھی؟ کہ محبت و پیار کی ایسی محفل جس کی چاشنی اور حلاوت آج بھی جب میں یہ داستان لکھ رہا ہوں میرے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت طاری کیے ہوئے ہے۔ اس کی باتیں آج بھی کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ اس سے بچھڑ جانے کا غم بھی دل پہ قیامت کا سماں پیدا کر رہا ہے۔ اس ملاقات سے دوسرے روز ہی مجھے میرے ماموں ساتھ لے کر میری خالہ کے پاس ایک گاؤں لے گئے تقریباً ایک ہفتہ میں گاؤں میں رہا اس دوران شہر کے بارے میں خبریں سن کر پریشان ہو جاتا اور اپنی والدہ کے لیے روتا رہتا۔ چونکہ اس وقت ہیضے کی وبا نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور اموات کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ شہر میں رہنا مشکل ہو چکا تھا۔ لوگ گھروں کو تالے لگا کر شہر چھوڑ گئے۔ چونکہ میری والدہ چنیوٹ میں اکیلی تھیں، والد صاحب مرحوم اس وقت کاکول اکیڈمی میں ''کیڈٹس'' کو انگلش گرامر پڑھانے پر مامور تھے۔ میں اپنی خالہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاس دن رات اپنی والدہ کے لیے روتا تھا۔ میری خالہ نے ایک روز مجھے پنڈی بھٹیاں سے ایک بس پر چنیوٹ کے لیے سوار کروادیا جب میں چنیوٹ اڈے پر اترا تو کوئی بشر مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ ایک پر ہول سناٹا تھا جو دل ودماغ پر خوف کی چادر تانے مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔ شہر جانے کی بجائے میں اڈے کے قریب چچا ڈاکٹر عزیز علی کے گھر آ گیا۔ ان کی اہلیہ مجھے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتی تھی اس نے مجھے پریشان دیکھ کر سینے سے لگا لیا پیار کیا۔ دلاسا دیا اور شہر کے غیر معمولی واقعات سے بھی مجھے آگاہ کیا۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد ایک لمبا اور گہرا سانس بھرتے ہوئے عزیز بھراڑے کی موت کی خبر سنا دی۔ عزیز بھراڑہ ان کا رشتہ دار بھی تھا اور انہیں ہماری دوستی کا بھی علم تھا میں تو خبر سنتے ہی سکتے میں آ گیا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ گھر سے باہر آ کر ان کے مکان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ اور عزیز کی موت کی خبر پر طرح طرح کے خیالات سے اپنے دل پہ غم واندوہ کے چرکے لگاتا رہا۔ آخر جی کڑا کر کے اٹھا۔ مجھ میں چلنے کی ہمت نہ تھی مگر چلنا پڑا راستہ انتہائی خوفناک تھا۔ گھر تک مجھے صرف ایک یا دو آدمی ملے ہوں گے۔ دکانیں بند، مکانوں کو تالے، شہر سنسان، دیوار و در سے خوف آتا تھا۔ گھر آیا تو اپنے گھر پہ بھی تالہ لگا ہوا تھا مزید پریشان ہو گیا۔ اب کیا کروں، سوچا بڑے ماموں کے گھر جاؤں شاید وہاں کوئی ہو تو ان سے والدہ کے بارے میں دریافت کروں۔ جی کڑا کے پھر وہاں سے اپنے بڑے ماموں مولوی محمد دین راجھہ مرحوم کے گھر آیا تو وہاں میرے ماموں زاد بھائی محمد اسحاق راجھہ موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ انہوں نے کہا تم کہاں آ گئے ہو؟ تمہاری والدہ ”رتلے“ تو سکھیکی منڈی کے ساتھ ایک گاؤں ہے وہاں چلی گئی ہیں۔ ہمارے گھر والے بھی ان کے ساتھ ہی ہیں۔ بھائی اسحاق نے ایک روٹی چینی پر لیموں نچوڑ کر مجھے کھلائی اور پھر میں بس میں بیٹھ کر اپنی والدہ کے پاس اس گاؤں میں آیا۔ والدہ اور دونوں بھائیوں صغیر اور نصیر کو دیکھ کر خوش ہوا مگر اس کے باوجود میرے اوسان پر عزیز کی موت چھائی ہوئی تھی رہ رہ کر مجھے اس کا خیال ستاتا اور میں مضطرب ہو کر رہ جاتا۔ اس دوران چنیوٹ میں بارش ہوئی اور وبا کا اثر ختم ہوا تو بند مکان کھلنے لگے۔ میں بھی اپنی والدہ کے ساتھ واپس چنیوٹ آ گیا۔ لیکن گھر میں اکثر پریشان اور خاموش رہتا۔ والدہ نے کئی مرتبہ پریشانی کی وجہ پوچھی مگر میں جواب نہ دیتا۔ گھر سے نکل کر عزیز کے مکان کے سامنے جا بیٹھتا، سوچتا شاید خبر غلط ہو، عزیز ادھر سے آ جائے گا۔ اس گلی سے نکل کر میرے سامنے آئے گا تو میں اس سے باتیں کروں گا لیکن کہاں، یہ سب تو نفسیاتی طور پر اس کی موت کو قبول نہ کرنے کی باتیں تھی۔

جب میں دوسرے احرار دوستوں سے ملا تو اس وقت مجھے اس کی موت کے بارے میں یہ تفصیل موصول ہوئی کہ موت والے دن صبح روزہ رکھ کر وہ چند لڑکوں کے ساتھ دریا پر چلا گیا تھا۔ واپسی پر روزہ افطار کیا تو رات کو طبیعت خراب ہو گئی، صبح سورج طلوع ہونے سے پیشتر ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جس رات اس کی موت واقع ہوئی صبح کو اس کے باپ نے قادیان جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ وہ اسے قادیان لے جا کر اسے مرزا بشیر الدین سے اس کی بیعت کروانا چاہتا تھا۔ لیکن سامان بندھا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تجھے قادیان نہیں جنت لے جاتا ہوں۔ کہ تیرا مقام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قادیان نہیں ہے، جنت ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ جنت میں ہی ہوگا۔

ادھر والدہ صاحبہ کو بھی میں نے اپنی خاموشی و پریشانی کی وجہ بتا دی کہ مجھے عزیز کے بچھڑنے کا دکھ اور غم ہے انہوں نے کہا کہ وہ تو چند روز پہلے میرے بلوانے پر میرے پاس آیا تھا میں نے اسے تیرے والد کو خط لکھنے کے لیے کہا اس نے خط لکھ کر بھیج دیا اور پوچھ رہا تھا کہ شبیر نے کب واپس آنا ہے میں تو اس کے لیے اور اداس ہوں۔ اسے جلدی بلوا دو لیکن اسے کیا معلوم کہ اب اس سے ملاقات اس جہان میں تو نہیں البتہ اس جہان میں ضرور ہوگی۔ بعد میں ہم سب احراری نونہال ایک مدت تک اس دن کو جس دن عزیز کا انتقال ہوا تھا ''عزیز ڈے'' کے طور پر مناتے رہے۔ لیکن یہ خواہش حسرت ہی بن گئی کہ اس کی یاد میں کوئی ایک آنسو آنکھ سے ٹپک پڑے۔ یہ حسرت آج تک جب میں اس کی کہانی لکھ رہا ہوں پوری نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں۔ دل کو تسلی دینے کے لیے اس کی یاد میں اپنا ہی شعر پڑھ لیتا ہوں

جب بھی یاد آتے ہیں خالد مجھے بچھڑے ساتھی
کچھ ستارے سے چمکتے سرِ مژگاں دیکھوں

یا پھر یہ شعر پڑھ کر اسے یاد کر لیتا ہوں

وہ اس طرح سے روح میں میری اتر گیا
بارش کی بوند سیپ میں جیسے ٹپک پڑے

(جاری ہے)

☆☆☆

ماہانہ مجلس ذکر و اصلاحی بیان
27 اکتوبر 2011ء
جمعرات بعد نماز مغرب
ابن امیر شریعت
حضرت پیر جی
سید عطاء المہیمن بخاری دامت برکاتہم
امیر مجلس احرار اسلام پاکستان
دارِ بنی ہاشم
مہربان کالونی ملتان
الداعی سید محمد کفیل بخاری ناظم مدرسہ معمورہ دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان
061-4511961

© rasailojaraid.com